یوگندر سکند

انگریزی سے ترجمہ: مولانا وارث مظہری

# ہندوستانی مدارس اور دہشت گردی

(یوگندر سکند انگلش کے ماہر قلم کار و مصنف ہیں۔ مسلم موضوعات سے انہیں خصوصی دلچسپی ہے' اس تعلق سے بکثرت ان کی تحریریں اخبارات و مجلات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یونیورسٹی آف لندن سے انہوں نے تبلیغی جماعت کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی جو Orient Longman, Dehli سے "دی اور یجنس اینڈ ڈیولپمنٹ آف دی تبلیغی جماعت" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ فی الحال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار دی اسٹڈی آف اسلام ان دی ماڈرن ورلڈ" (ہالینڈ) میں پوسٹ ڈاکٹریٹ کے طالبعلم ہیں اور ہندوستانی مدارس پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ مترجم)

ستمبر ۲۰۰۱ء میں عالمی تجارتی مرکز (W.T.C) کے جڑواں مناروں کو جہازی بم کے ذریعہ زمین بوس کردئے جانے کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کے نتیجے میں فکر وتشویش کا وہ ماحول پیدا ہوا' جس میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے' یہ فکر وتشویش اس بات کو لے کر تھی جسے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بنیاد پرست اسلامی تحریکات کا نام دیا جاتا ہے' ان حملوں کی بناء سرکاری اہل کاروں' پالیسی سازوں اور عمومی سطح پر لوگوں کے درمیان مدارس سے متعلق دلچسپی اور تجسس میں اضافہ ہوا' جن سے متعلق لوگوں کی معلومات نہایت محدود اور سطحی نوعیت کی ہیں۔ موضوع سے متعلق تفصیلی اور ہمہ گیر معلومات کے فقدان' نیز عصبیت اور پیش ساختہ نظریات کے ماتحت صحافیوں اور قلم کاروں کی ایک قابل ذکر تعداد نے اپنے ایجنڈے کو آگے لے جانے کی غرض سے مدارس پر یہ الزام چسپاں کیا کہ وہ بالفعل دہشت گردی کا اڈہ ہیں' جہاں سے مذہبی تعصب کے شکار اسلامی جنگ باز پیدا ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے مدارس کے بارے میں قلم اٹھایا ہے ان میں سے بہتوں نے شاید بذات خود کبھی مدارس کے اندر قدم بھی نہیں رکھا ہوگا۔ اس کے باوجود ان لوگوں کی طرف سے جو ان صحافیوں کی مدارس سے متعلق ہر بات پر آمنا وصدقنا کہنے کا مزاج بنا چکے تھے' انہیں اعلیٰ اتھارٹی قرار دے کر ان کے قد کو بلند کرنے کی کوشش کی گئی۔

بنیادی طور پر مدارس سے متعلق ملک کے طول وعرض میں آج کل جو گرما گرم بحث ومباحثہ جاری ہے' اس کا سرا اصلاً اس لاعلمی اور ناواقفیت سے جا ملتا ہے جو مدارس سے متعلق شائع وذائع ہے۔ مدارس سے متعلق مخاصمت کی موجودہ فضا کو ہندوستان میں تعلیم سے متعلق برتے جانے والے دوعملی کے رویے کے سیاق وسباق میں دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ماضی میں شمالی ہندوستان کے ایک بہت بڑے حصے میں ہندو اور مسلم دونوں فرقوں کے بچے مشترکہ طور پر گاؤں کے مکتب یا مدرسے کا رخ کرتے تھے۔ جہاں انہیں اقدار پر مبنی زبان اور سماجیات سے متعلق تعلیم دی جاتی

تھی۔ راجہ رام موہن رائے جنہیں ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا بانی تصور کیا جاتا ہے ایک مدرسے کے ہی تعلیم یافتہ تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے، اور آج کم ہی ہندو ایسے ہیں جو اس سے واقف ہیں یا انہیں اس کی پرواہ ہے۔ آج بمشکل ہی کوئی ہندو مدرسہ میں پڑھتا ہے، بنابریں وہ اس بات سے ناواقف ہوتے ہیں کہ اہل مدارس ان مدرسوں میں کیا پڑھاتے ہیں اور ان کے بنیادی تعلیمی مقاصد کیا ہیں؟ یہی بات بہت سے متوسط طبقے کے مسلمانوں سے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے جو مدارس کے بجائے اپنے بچوں کو جدید اور عصری اسکولوں میں بھیجے جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

صحافیوں نے دینی مدارس کو تشدد پسندانہ نظریات رکھنے والی تحریکات کے ہم مثل ٹھہرانے اور اس بات کے اثبات میں ذرا بھی دیر نہ کی کہ انہی کی طرح یہ بھی دہشت گردانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ حالانکہ یہ بات قطعی طور پر گمراہ کن ہے۔ جنوبی ایشیا میں صدیوں سے مدارس کا سلسلہ چلا آرہا ہے اور کم و بیش دو صدیوں سے عمومی سطح پر اسکے نصاب میں کوئی بنیادی فرق نہیں آیا۔ جو لوگ مدارس پر دہشتگردی کے اڈہ ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں، وہ اس بات کو نظرانداز کردیتے ہیں کہ مدارس کا نصاب اپنے عمومی مزاج کے اعتبار سے حقیقتاً جنگ و جدال سے اعراض اور اس سے دامن کشی کے نقطہ نظر پر مبنی ہے۔ اس طرح اس کا سیاست سے بھی کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ انکے تعلیمی نصاب کا اصل زور فقہ کی مبادیات، مخصوص عبادات کے پیچیدہ احکامات، لباس اور اسی طرح دیگر ضابطوں پر ہے جن میں صنفی فرق و امتیاز کو روا رکھا گیا ہے۔ اس طرح گویا یہ نصاب بہت زیادہ قدامت پسندانہ، حرفیت پر مبنی اور قانونی ہے۔ لیکن سیاسی طور پر وہ ہرگز تشدد پسندی پر مبنی نہیں ہے۔ مدارس کے ناقدین ان کیساتھ رقابت رکھنے والے اسلام پسند حضرات وقتاً فوقتاً اہل مدارس پر یہ الزام دھرتے رہتے ہیں کہ وہ مسلم کمیونٹی کو کمزور کررہے ہیں اور دشمنان اسلام کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، اس کی دلیل ان کے پاس یہ ہے کہ وہ سلگتے ہوئے سیاسی موضوعات سے اپنی نظریں موندے ہوئے ہیں اور (ان کے بقول) بال کی کھال نکالنے والے لاحاصل موضوعات جیسے داڑھی کے طول کی مقدار کیا ہونی چاہیے، یا رفع حاجت کے بعد پاکی کا صحیح اسلامی طریقہ کیا ہے، میں سر کھپاتے اور مغزماری کرتے رہتے ہیں۔ ریڈیکل رجحان رکھنے والی اسلامی تحریکات، جیسا کہ مختلف سروے اور میدانی مطالعوں سے ثابت ہوتا ہے، روایتی مدارس میں بمشکل ہی کوئی جگہ بنا پاتی ہیں۔ اسکے بجائے اس کی جگہ کالج اور یونیورسٹیاں، خاص طور پر انکے 'ہارڈ' سائنس کے شعبے ہیں جیسے انجینئرنگ، میڈیسن وغیرہ، یہ وہ حقیقی مظہر ہے، جسے صرف جنوبی ایشیاء میں ہی نہیں بلکہ عالم عرب اور مغربی دنیا میں بھی محسوس کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے واقعے میں شامل عرب نوجوانوں میں سے جن پر اس واقعے کو وجود میں لانے کا الزام عائد کیا گیا، ایک شخص بھی مدرسے کا تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ خود اسامہ بن لادن کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ان لوگوں نے تقریباً تمام دوسری اسلامی شدت پسند جماعتوں کے قائدین کی طرح عصری جامعات میں تعلیم حاصل کی تھی بلکہ ان میں سے بہت سوں نے تو خود مغرب میں تعلیم پائی تھی۔

تشدد پسندانہ اسلامی نظریات رکھنے والے لوگ شدت کے ساتھ علما پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ فکری جمود کے

شکار ہیں۔ انہیں اس دنیا اور اس کے امور سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ وہ مسلم ممالک میں اس حکمراں طبقے کے مفاد کے لئے کام کرتے ہیں جو انکار پسند مغرب کے غلام یا خادم ہیں۔ اور اسلام کا دم بھرنے کے باوجود محض نام کے مسلمان ہیں۔ متعدد مسلم ممالک میں اعلیٰ قابلیت و صلاحیت رکھنے والے علماء کو جنگ کے پروقار عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے۔ بہت سے ممالک انتہا پسند اسلامی جماعتوں کے اثرات کو کم کرنے کیلئے علماء کی مدد حاصل کرتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ یہ علماء ان انتہا پسند جماعتوں کے خلاف فتوے صادر کرتے اور ان کی سرگرمیوں کو غیر اسلامی ٹھہراتے ہیں۔

یہ انتہا پسند جماعتیں فقہ دانوںؒ کی صدیوں سے چلی آرہی اس روایت کو' جو علماء کی اجتماعی قوت واثر کا سرچشمہ ہے' خاطر میں لانا نہیں چاہتے۔ اسکے بجائے وہ براہ راست قرآن وسنت سے استفادے کی دعویدار ہوتی ہیں۔ انکے بقول اسلام میں مذہبی اجارہ داری کا کوئی تصور نہیں ہے جیسا کہ علماء نے فی زمانہ اپنے آپ کو اس انداز میں ڈھال لیا ہے' قدیم فقہ پر عمل کے بجائے یہ حضرات سارا زور اجتہاد پر دیتے ہیں۔ حالانکہ بہ مشکل ہی کوئی ایسی مثال ہوگی کہ انہوں نے فقہ کو باضابطہ مربوط طور پر نئے انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ہو۔ مزید براں یہ لوگ جدید ٹکنالوجی کے چیلنجز کو سنجیدہ طور پر لیتے ہیں۔ جبکہ علماء کو بالعموم اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔ ان کی نظر میں اسلام کا مرکزی نقطہ سیاسی اقتدار کا حصول ہے' تاکہ اسلامی ریاست کے زیر سایہ' مسلمان اسلامی احکامات کے مطابق' پورے طور پر زندگی گزار سکیں' جبکہ مدارس کے علماء' اسلامی فقہ پر اصل زور دیتے ہیں' غیر اسلامی ریاست میں وہ اس وقت تک برسر مخالفت یا آمادہ پیکار ہونے کو صحیح نہیں سمجھتے جب تک انہیں وہاں اسلامی احکامات کی بجا آوری میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور ان کا پرسنل لا محفوظ ہو۔ دوسرے لفظوں میں انتہا پسندانہ نظریات رکھنے والی اسلام پسندی' مقابلے اور کشمکش کے رجحان کی حامل ہوتی ہے' جبکہ روایتی مدارس کی اسلام پسندی محافظت اور عملی ہم آہنگی کا مزاج رکھتی ہے' ہاں البتہ ان دونوں معاملوں میں کچھ استثناء ضرور ہوسکتا ہے کہ کچھ اسلام پسند بین مذہبی مذاکرات کے قائل ہیں اسی طرح بعض مدارس سے وابستہ علماء جیسا کہ پاکستان میں نظر آتا ہے' مسلح جہاد کے زبردست حامی ہیں تاہم مجموعی طور پر بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں کسی بھی مدرسے کی جنگ جوئیت سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ جیسا کہ بار بار اس کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی مدارس اور دہشت گردی کے تعلق سے جو بات مختلف حلقوں میں بحث کا موضوع ہے اسے سیاسی تاریخی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ کیونکہ اولاً یہ بات ہر شخص کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہندوستان میں جنگوئیت جس نے وسیع پیمانے پر تشدد اور دہشت گردی کی شکل اختیار کرلی ہے' وہ بہت حد تک ہندو جماعتوں کی ہی خصوصیت ہے نہ کہ مسلم جماعتوں۔ بہت سی غلبہ پسندی کی نفسیات رکھنے والی ہندو تنظیمیں کھلم کھلا مسلمانوں اور دوسری کمزور اقلیتوں کے خلاف لوگوں کو تشدد پر آمادہ کرتی رہی ہیں اور ریاستی ایجنسیوں سے مل کر مسلمانوں کے اجتماعی قتل وخون ریزی میں ملوث رہی ہیں' جن میں اب تک ہزاروں بے قصور لوگ ہلاک ہوچکے ہیں۔ ہندو تنظیموں کے تحت ملک کے طول وعرض میں ہزاروں اسکول قائم ہیں۔ جن کے لاکھوں طلباء کو مسلمانوں اور غیر مسلم فرقوں کے خلاف بغض ونفرت کی تعلیم دی جاتی

ہے۔ ''ہندو قوم'' کے رکھوالوں کے روپ میں وہ تمام نسبتوں پر وطن پرستی کے عملی تفوق کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ اور ریاست کے حوالے سے ان کی تقریباً یہی شبیہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایسا دیکھنے میں بہت کم ہی آتا ہے کہ انہیں دہشت گرد جماعتوں کا نام دیا جاتا ہو۔ ہندوستان کے دینی مدارس کو جن کا دہشت گردی یا جنگ جوئیت کی کارروائیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے' دہشت گردی کا اڈہ تصور کیا جاتا ہے جبکہ ہندو جماعتوں کی نگرانی اور سرپرستی میں چلنے والے اسکول اور تنظیموں کو بالعموم پر فخر طور پر قوم پرست تصور کیا جاتا ہے اور اس شکل میں دیکھا جاتا ہے کہ وہ ملک کی عزت و وقار کا دفاع کرنے والی ہیں جنہیں داخلی اور خارجی دونوں سطح کے دشمنوں سے زبردست اور مستقل خطرہ ہے۔

آج کل ملک کے اندر اعلیٰ حکومتی اہل کار' ہندو کے شعلہ بار لیڈر اور میڈیا کا ایک بہت بڑا حلقہ اس بات کی دعوے داری کرتے نہیں تھکتا کہ دینی مدارس دہشتگردوں کو تربیت دے کر ہندوستان کو کمزور کرنے کیلئے پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کیساتھ ملک کر سازشوں میں مشغول ہیں۔ حالانکہ اس بات کا اب تک کوئی بھی واضح ثبوت پیش نہیں کیا جاسکا ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ مدارس کے تئیں حکومت کی بڑھتی ہوئی مخاصمت آنے والے دنوں میں مدارس کیلئے بہت سے مسائل و مشکلات پیدا کرے گی' یہ جاننے کیلئے کہ حکومت کا مدارس سے کیا رشتہ رہا ہے' ہمیں پورے معاملے پر تاریخی حیثیت سے نظر ڈالنی ہوگی۔

پہلی بات تو یہ محسوس ہوتی ہے کہ حکومت نے اب تک مدارس میں دی جانے والی تعلیم کے تعلق سے کوئی باضابطہ اور واضح حکمت عملی طے کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ آج حکومت مدارس کو ایک بڑے چیلنج اور خطرے کی شکل میں دیکھتی ہے۔ جبکہ اس سے قبل حکومت کی طرف سے ہی بعض چنیدہ مدارس کو اپنے مقاصد کے لئے تیار و ہموار کرنے کی سعی کی جاتی رہی ہے۔ ''آئین ہند'' نے ملک کی تمام مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو اپنے پسند کے تعلیمی اداروں کے قیام کی اجازت دی ہے' اس کا مطلب یہ ہوا کہ قانوناً انہیں مدارس و مکاتب کو وجود میں لانے اور چلانے کی مکمل آزادی ہے' حکومت کی طرف سے بعض بڑے اور اہم مدارس کو' خاص طور پر دیوبند کو' بقول مشیر الحسن' ہندوستان میں سیکولرزم کے دعوے کیلئے ''شوکیس'' بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ (The Madrasas in India, Dailytiems, 22/May/2003) خارجہ پالیسی کے مفاد کے تحت نیز مشرق وسطی کے ممالک کو یہ بات باور کرانے کیلئے ہندوستان میں مسلمان محفوظ اور خوشحال ہیں' حکومت نے مدارس کو اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی اس کا مقصد اس کے برعکس پاکستان کے اس دعوے اور پروپیگنڈہ کا ابطال تھا کہ ہندوستان میں مسلمان پسماندہ اور غیر محفوظ ہیں' چنانچہ ۱۹۴۹ء میں وزارت داخلہ اور آل انڈیا ریڈیو کے اہل کاروں نے دیوبند کا دورہ کیا اور اپنے غیر ملکی نشریے کیلئے دارالعلوم دیوبند پر ایک پروگرام تیار کیا جس میں دل کھول کر دارالعلوم دیوبند کی حصولیابیوں کی تعریف و ستائش کی گئی۔ History of Darul Uloom Deoband (Vol.1) P.25 1980 از سید محبوب رضوی۔

کئی ایک ریاستی حکومتوں نے اپنے یہاں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ قائم کیا جس نے مدارس کو اگرچہ ایسے مدارس

کی تعداد قلیل ہے مالی مدد بہم پہنچائی۔ بڑے مدارس جیسا دارالعلوم دیوبند' ندوۃ العلماء وغیرہ کو سرکاری طور پر اپنے یہاں غیر ملکی طلباء کو داخلہ دینے کی اجازت دی گئی اور اس طرح بہت سے غیر ملکی طلباء کو حکومت کی طرف سے تعلیمی ویزے دیئے گئے۔ دارالعلوم دیوبند آج کل خاص طور پر حکومت کی نگاہ میں ہے جب کہ طالبان کے ساتھ مبینہ وابستگی کی بناء پر بعض حلقے پہلے ہی اسے ہدف تنقید بناتے رہے ہیں' یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ اس ادارے کو ملک و بیرون ملک میں مسلمانوں کے درمیان کتنا اہم مقام حاصل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مثال کے طور پر ۱۹۵۷ء میں اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد نے اس ادارے کا دورہ کیا تھا اور اس کی قدر شناسی کے علامتی اظہار کے طور پر ایک ہزار روپے کی پیش کش کی تھی۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند از سید محبوب رضوی صفحہ :۳۱) دارالعلوم دیوبند کے طلباء و اساتذہ کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے آزادی وطن کی جدوجہد کے تعلق سے اس کی عظیم خدمات کی تعریف و ستائش کی تھی اور اپنی اس امید کا اظہار کیا تھا کہ مستقبل میں بھی یہ ادارہ اپنی اس روایت کو برقرار رکھے گا اور اپنے دائرہ کار کو بڑھائے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مزے لے کر تحریک آزادی میں دیوبند سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے ساتھ اپنی شرکت کار کی تفصیل سامعین کے گوش گزار کی تھی۔ (صدر جمہوریہ ہندو دارالعلوم دیوبند میں : تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲۴-۲۵) انہوں نے آگے بڑھ کر یہاں تک کہا تھا کہ اس ادارے میں مختلف بیرونی ممالک سے طلباء تعلیم کے لئے آتے ہیں۔ یہ بات تمام ہندوستانیوں کیلئے فخر و عزت کی بات ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا اختتام اس دعا پر کیا تھا کہ یہ ادارہ پھلے پھولے اور ترقی کرے تا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک کو بھی اپنی خدمات سے بہرہ اندوز کر سکے' ایضاً ص:۲۷)

کانگریس پارٹی کے قائدین نے دیوبند کے ساتھ ہمیشہ اچھا تعلق رکھا۔ کیونکہ وہ دارالعلوم دیوبند کی قدر و وقعت اور مسلم رائے دہندگان کے ایک بہت بڑے طبقے کے درمیان اس کے علماء کے اثرات سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء میں اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی نے دارالعلوم کے جشن صد سالہ میں شرکت کیلئے دیوبند کا دورہ کیا تھا۔ اندرا گاندھی نے اپنی تقریر میں تحریک آزادی میں دارالعلوم دیوبند کی مساعی کی ستائش کی تھی اور اپنی اس امید کا اظہار کیا تھا کہ یہ ادارہ اپنے بزرگ اور اسلاف کی اس روایت کو برقرار رکھے گا۔ (دارالعلوم دیوبند ایک مکتب فکر ایک تحریک: حبیب الرحمٰن قاسمی ص۔۳۱) شاید مسلم ووٹ کو نظر میں رکھتے ہوئے انہوں نے علماء دیوبند' ان کی علمی حیثیت' وطن کے تئیں ان کی محبت اور ہندوستان کے تکثیری معاشرہ کیلئے ان کی خدمات کی مدح سرائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اسی سال حکومت نے دارالعلوم کے اعزاز میں ۳۰ پیسے کا ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا تھا' گزشتہ سالوں کے دوران جن اہم غیر مسلم شخصیات نے دارالعلوم کا دورہ کیا اور اس کے کام کی تعریف کی' ان میں چند نام یہ ہیں:

(۱) جگدیش سہائے' جج الہ آباد ہائیکورٹ (۱۹۶۳) (۲) اجیت پرساد جین' گورنر کیرالا (۱۹۶۵) (۳) گوپال ریڈی' گورنر اتر پردیش (۱۹۶۹) (۴) واسود یو سنگھ' اسپیکر یو پی قانون ساز اسمبلی (۱۹۷۶) (۵) رام نریش' نائب

وزیر اعلیٰ اتر پردیش (۱۹۷۹) (٦) ویر بہادر سنگھ وزیر اعلیٰ اتر پردیش (۱۹۵۸) (ایضاً: ص: ۳۰۔۳۹) دیو بند کے علماء نے ادارے کے ساتھ اس لگاؤ اور اسے مرکز توجہ بنائے جانے کے اس عمل کا دل سے خیر مقدم کیا۔ کیونکہ اسکے ذریعہ انہیں بھی مسلم حلقوں میں عزت و وقار حاصل ہوا۔ اسکے ذریعہ انہیں یہ موقع بھی ملا کہ وہ مادر وطن کے تئیں اپنی محبت کا ثبوت پیش کرسکیں اور تحریک آزادی کے تعلق سے اپنے اسلاف کی خدمات کو اجاگر کرسکیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی مدارس نے ہندو حکمرانی کے حالات سے تقریبا عملی سمجھوتہ سا کرلیا ہے۔ اکثر مدارس حکومت وسیاست سے دامن کش ہیں اور عام طور پرامن پسند اسلام کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اگرچہ مدارس سے وابستہ بہت سے علماء اس بات میں یقین رکھتے آئے ہیں کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ہمہ گیر ضابطوں کو عمل میں لانے کا مکلف کیا ہے جو بشمول سیاست شخصی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ تاہم بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ وہ محدود انداز میں مسلم پرسنل لا کی حد تک اسلامی قوانین کے نافذ العمل ہونے پر قانع ہیں جیسا کہ اقلیت ہونے کی حیثیت میں آئین کی رو سے انہیں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اس طرح مسلم پرسنل لاء اس شکل میں سامنے آتا ہے کہ اس سے ہندوستان کے اندر علیحدہ مسلم شناخت کی واضح تعین ہوتی ہے۔

اکثر مدارس کے نصاب میں بھی اس بات کی عکاسی ملتی ہے۔ ایسے مدارس فقہ کے انہی مسائل پر زور دیتے ہیں، جن کا تعلق عبادات یا شخصی مذہبی معاملات سے ہے۔ البتہ چند ایک مدرسوں میں عہد وسطی میں لکھی گئی کتب فقہ کے بعض سیاسی امور سے تعلق رکھنے والے ابواب ضرور پڑھائے جاتے ہیں اور انہیں غیر ضروری یا بے مطلب کی چیز بھی تصور نہیں کیا جاتا اس بات پر بھی زور دیا جاتا ہے کہ اگرچہ امور سیاست اور قانون عامہ سے تعلق رکھنے والے فقہی (شرعی) احکام اسلام کا اٹوٹ جز ہیں۔ تاہم جب تک مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں، یہ بات بے عقلی کی ہوگی کہ یہاں کسی ایسی اسلامی ریاست کی بات کی جائے جس میں مکمل طور پر قانون شریعت پر عمل داری ہوتی ہو، دینی مدارس ریاست کو اسلامیانے یا اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی بجائے خاص طور پر ہندوستان میں مسلم مذہبی تشخص کے بقاء و تحفظ کے لئے فکر مند و کوشاں ہیں۔ انہیں ہندو کرن کی تحریک سے خطرہ ہے جسے موجودہ حکومت شہ دے رہی ہے اور جو ہندو اساطیر سے ماخوذ واحد طرز کی ہندوستانی قومیت (ہندو قومیت) کے نام پر ملک میں چلائی جارہی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں بڑی تعداد میں مدارس کے قیام کی وجہ بھی یہی ہے۔ یہ تمام مدارس آخری حد تک سیاست سے دور اسلام کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کا سارا زور مسلم بچوں کو اسلامی عقائد اور مذہبی رسوم کی تعلیم پر ہوتا ہے۔ ہندوستان کے تمام ہی دینی مدارس اسی نہج پر چل رہے ہیں۔ انکے نصاب تعلیم میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اسلئے یہ کہنا کہ وہ اب دہشتگردی کے اڈے بن چکے ہیں، سراسر ایک بے بنیاد اور غلط الزام ہے۔ (ترجمان دارالعلوم فروری ۲۰۰۴)